الفاظِ طلاق

مفتی شعیب عالم
مفتی دارالافتاء واستاذِ جامعہ

احتیاط اور تفہیم

نکاح فطرت ہے، فطرت ہے تو طبیعت ہے، طبیعت ہے تو ضرورت ہے، ضرورت ہے تو شریعت ہے اور شریعت ہے تو عبادت ہے۔ عبادت ہے تو اس کا طریقہ مقرر ہے، اس لیے اسے مرضی کے مطابق نہیں، بلکہ شریعت کی منشا کے مطابق انجام دیا جائے گا۔

نکاح عبادت ہے تو بڑے عبادت گزاروں نے اسے ضرور انجام دیا ہوگا، چنانچہ نکاح' انبیاء کرام (علیہم الصلوٰۃ والسلام) کا اُسوہ اور صلحاء کا طریقہ ہے۔

نکاح عبادت ہے تو اس سے تزکیۂ نفس کا مقصد ضرور حاصل ہوگا، چنانچہ نکاح' نگاہوں کو پاک، خیالات کو پاکیزہ، جذبات کی تسکین اور ایمان کی تکمیل کرتا ہے۔

نکاح عبادت ہے تو اس کے پس پشت انسانیت کی فلاح کا مقصد ضرور پیش نظر ہوگا، چنانچہ نوعِ انسانی کی بقاء، نفس پر ضبط، شہوت پر کنٹرول، اخلاق کو سنوارنے، فواحش سے بچنے اور پاکدامنی کے حصول کے لیے نکاح سے بڑھ کر کوئی نسخہ نہیں، اسی شریفانہ طریقے سے توالد وتناسل کا سلسلہ جاری رہتا ہے، اسی سے نام اور کام باقی رہتا ہے، اسی سے مرد وعورت کے تعلقات جائز، اولاد کا نسب درست اور باہم حقوق وفرائض پیدا ہوتے ہیں اور اسی سے خانگی نظام کی اصلاح ہوتی ہے، جس پر تمام ہیئتِ اجتماعی کی درستگی کا انحصار ہے۔

عبادت کے ساتھ نکاح ایک سماجی معاہدہ بھی ہے۔ معاہدہ دوطرفہ عمل ہوتا ہے جو باہمی رضامندی سے تشکیل پاتا ہے، باہمی رضامندی کا اظہار الفاظ سے ہوتا ہے، اس لیے ہر معاہدے کی طرح نکاح کا معاہدہ بھی الفاظ سے وجود میں آتا ہے، چنانچہ رضامندی کے دو بول ہوتے ہیں جو سماعت

سے ٹکرا کر ختم اور ہوا میں اُڑ کر تحلیل ہو جاتے ہیں، مگر کہنے والوں کو ایک بندھن میں باندھ دیتے ہیں۔

ایسا مقدس بندھن جو معنوی پہلو سے فولاد سے زیادہ سخت، شہد سے زیادہ میٹھا، ہر قسم کے مادی تعلقات سے زیادہ مضبوط، دوررس اثرات کا حامل اور ان گنت فوائد پر مشتمل ہوتا ہے۔

نکاح جس قدر فوائد پر مشتمل ہے، اس کا ٹوٹنا اتنا ہی مضر ہے۔ دو خاندانوں میں محبت' نفرت سے اور اُلفت' عداوت سے بدل جاتی ہے۔ خاندانی نظام کی بنیادی اکائی منہدم ہو جاتی ہے، خانگی نظام متزلزل ہو جاتا ہے، بچوں کا مستقبل، تاریک اور زوجین کا معاشرتی وقار سب دریا برد ہو جاتا ہے، اسی وجہ سے طلاق کو ''أبغض المباحات'' کہا گیا ہے۔ جو لوگ عجلت میں اس کا استعمال کرتے ہیں اور اس کے ذریعے اپنے جوشِ انتقام کو تسکین دیتے ہیں، وہ جہالت کا شکار، عنداللہ مجرم اور سخت غلطی پر ہیں۔

نکاح سے زیادہ حساس، باریک اور نازک معاملہ ایمان کا ہے، مگر لوگ اس کے بارے میں کس قدر محتاط واقع ہوئے ہیں!؟ زمانے کے نبض شناس بہت پہلے مرض کی تشخیص اور اس کے ساتھ نسخہ تجویز کر چکے ہیں۔

فتاویٰ کی معروف کتاب ''شامی'' میں ''تبیین المحارم'' کے حوالے سے ہے کہ احتیاط یہ ہے کہ عام آدمی ہر روز اپنے ایمان کی اور مہینے میں ایک دو مرتبہ اپنے نکاح کی تجدید کر لیا کریں، کیونکہ غلطی مرد سے نہ سہی، مگر عورتوں سے بہت زیادہ ہو جایا کرتی ہے:

''والاحتياط أن يجدد الجاهلُ إيمانَهُ كلَّ يوم، ويجدد نكاحَ امرأتهِ عند شاهدين في كل شهر مرةً أو مرتين، إذ الخطأ وإن لم يصدر من الرجل فهو من النساء كثير.'' (فتاویٰ شامی، ج:۱،ص:۴۲، دارالفکر-بیروت، الطبعۃ الثانیۃ، ۱۴۱۲ھ-۱۹۹۲ء)

یہ اس زمانے کی بات ہے جو دینی شعور، خوفِ خدا اور فکرِ آخرت کے اعتبار سے بہرحال اچھا تھا، مسلمان دینی مسائل سے آج کے مقابلے میں زیادہ بہتر واقفیت رکھتے تھے، شریعت رواج میں تھی، اس لیے مکتب اور کتاب کے بغیر محض ماحول کی برکت سے لوگ بہت کچھ دینی مسائل جان جایا کرتے تھے۔ اس کے ساتھ معاشرے پر اسلامی رنگ اور روحانیت کی چھاپ غالب تھی اور اس کی عمومی فضا دینی اور مذہبی تھی، ان وجوہ کی بنا پر شریعت پر عمل آسان تھا اور معاشرے سے کٹ کر چلنا دشوار، اور جمہور کی مخالفت میں قدم اُٹھانا مشکل تھا۔

اب جب کہ ماحول نہ رہا تو بدیہی مسائل' نظری اور آسان اعمال' مشکل ہو گئے۔ معاشرتی روک ختم ہوا تو دبی برائیوں کو اُبھرنے اور شر کو سر اُٹھانے کا موقع مل گیا۔ روشنی کمزور پڑنے لگتی ہے تو

اندھیروں کے حوصلے بڑھنے لگتے ہیں اور ظلمتیں راج کرنے لگتی ہیں۔ آفتابِ نبوت سے دوری بڑھتی جارہی ہے تو قلوب میں ایمان کی حرارت اور سینوں میں اس کی تمازت ماند پڑتی جارہی ہے۔ آج ایمان کی وہ قوت، اعمال کا وہ جوش وجذبہ اور اخلاق کی وہ کیفیت نہ رہی جو کبھی ہوا کرتی تھی۔ خدا کا خوف اور آخرت کا دھیان کم ہوا تو نتیجہ یہ نکلا کہ نفس کی لگامیں کمزور اور زبان پر گرفت ڈھیلی پڑ گئی، چنانچہ آج کھلی آنکھوں مشاہدہ ہوتا ہے کہ نگاہیں آوارہ اور زبانیں بے قابو ہیں، لوگ اَناپ شناپ بولتے رہتے ہیں، جس سے ایمان سلب ہونے، اعمال غارت ہونے اور نکاح ٹوٹنے کا خطرہ لگا رہتا ہے۔

ایمان کی طرح نکاح کا معاملہ بھی اہمیت میں کچھ کم نہیں، دونوں میں اس لحاظ سے بڑا جوڑ بھی ہے کہ آخرت میں بھی یہ دونوں باقی رہیں گے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت کو ایمان کی طرح نکاح کی بقاء بھی مطلوب ہے۔ اسی وجہ سے ابلیس لعین کو سب سے زیادہ خوشی اسی کے ٹوٹنے سے ہوتی ہے، مگر مسلمان ہیں جو اس لعین کو خوشیاں منانے اور بغلیں بجانے کا موقع فراہم کرتے رہتے ہیں، اگر یقین نہ آئے تو کسی خاندان کے اندرونِ خانہ جھانک کر دیکھیے:

''دو میاں بیوی ہیں اور دونوں نیک طینت، خوب صورت اور خوب سیرت ہیں، معاشی طور پر خوش حال اور اولاد کی نعمت سے مالا مال ہیں۔ غرض ہنستا بستا گھرانہ اور دنیا میں جنت کا نمونہ ہے، مگر دو برتن ساتھ رکھے ہوئے تو کھنکنے کی آواز آ ہی جاتی ہے، میاں بیوی بھی ایک اور نیک سہی، مگر مختلف طبیعتوں اور متضاد خواہشات کے مالک ہوتے ہیں، اس لیے ان کے مابین بھی نوک جھونک اور تُو تکرار ہو ہی جاتی ہے، شیطان اُسے مزید بڑھا، بڑھکا بلکہ دہکا دیتا ہے، نتیجۃً ''الشر مبدأه أصغره'' کا مقولہ صادق آجاتا ہے۔ معمولی بات سے شروع ہونے والا جھگڑا جب شدت اختیار کرنے لگتا ہے تو شوہر ضبطِ نفس کھونے لگتا ہے، بیوی بھی جب غصے سے مغلوب ہوجاتی ہے تو اینٹ کا جواب پتھر سے دینے لگتی ہے، بات گالم گلوچ تک جا پہنچتی ہے اور کبھی مار پیٹ کی نوبت بھی آجاتی ہے۔ شوہر تنگ آکر طلاق کی دھمکی دیتا ہے تو بیوی اُسے دھمکی پر عمل کرنے کا کہتی ہے۔ جب وہ کہتا ہے کہ میں طلاق دے دوں گا تو اسے جواب ملتا ہے کہ طلاق تو ہوتی ہی دینے کے لیے ہے، اس لیے دے ڈالو۔ یہ سن کر شوہر کا پارہ مزید چڑھ جاتا ہے اور وہ طلاق دے ڈالتا ہے، مگر دے کر بھی نہ شوہر کا غصہ ٹھنڈا ہوتا ہے اور نہ ہی بیوی کی تسلی ہوتی ہے، اس لیے وہ سنتے ہی جواب دیتی ہے کہ جب ایک دے دی ہے تو اب بقیہ بھی دے ڈالو، تاکہ معاملہ بالکل ہی ختم ہوجائے، چنانچہ شوہر بقیہ دو بھی دے ڈالتا ہے۔ یوں گھرانہ اُجڑا اور آشیانہ تنکا تنکا بکھر جاتا ہے، جس کا خمیازہ نسلیں بھگتتی ہیں۔''

مقصد طلاق کی مذمت بیان کرنا نہیں ہے، کیونکہ وہ تو فی نفسہٖ ایک نعمت ہے اور اگر آخری چارہ کار کے طور پر شوہر اس حق کو استعمال میں لائے، جبکہ صلح وصفائی کی تمام کوششیں ناکام ہوگئی ہوں تو وہ کسی لعنت وملامت کا مستحق نہیں ہے، بلکہ سلیقے اور طریقے سے اس رشتے کو ختم کرنے کا پابند ہے، ''فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ'' کی قرآنی تعلیم اسی موقع کے لیے ہے۔ عیسائی تصورِ نکاح کی طرح اسلام میں نکاح کوئی ایسا آسمانی اور اَٹوٹ رشتہ نہیں ہے جس کو بندے وجود میں تو لا سکتے ہوں، مگر اس کو ختم کرنے پر قدرت نہ رکھتے ہوں۔

مقصد ان لوگوں کی مذمت بیان کرنا ہے جو بے ضرورت یا عجلت میں طلاق دیتے ہیں، یا طلاق کے ذریعے اپنے جوشِ انتقام کی تسکین کرتے ہیں، یا طلاق دے دیتے ہیں، مگر اس کے باوجود رشتۂ زوجیت برقرار رکھتے ہیں، یا بے دھیانی میں طلاق کے الفاظ استعمال کر لیتے ہیں، حالانکہ جب نکاح نہ رہے تو تعلقات گناہ اور اولاد ناجائز رہتی ہے۔ طبرانی کی روایت کے مطابق لوگ آخری زمانے میں اپنی بیویوں سے زنا کریں گے، جس کی صورت یہی ہوگی کہ یا طلاق کے بعد بیویوں کے قریب جائیں گے یا طلاق دے چکے ہوں، مگر اس سے غافل ہوں گے۔

اوپر کی سطور میں بطور تمثیل میاں بیوی کے درمیان جس جھگڑے کا ذکر ہوا، اس میں شوہر نے طلاق کا صریح لفظ استعمال کیا، جس سے طلاق کا وقوع ہر خاص وعام جانتا ہے اور فقہ کے طالب علم کے لیے بھی اس کا حکم بتانا آسان ہے، کیونکہ صریح تو اپنی وضاحت آپ ہوتا ہے، جیسے: ''آفتاب آمد دلیلِ آفتاب'' مگر اسی نوک جھونک کے ماحول میں جب بیوی طلاق بھی مانگ رہی ہو، اگر شوہر درج ذیل الفاظ استعمال کرے:

''میری تم سے توبہ، میں تمہیں نہیں چاہتا، پسند نہیں کرتا، رغبت نہیں رکھتا، اُمید نہیں رکھتا، الگ کرنا چاہتا ہوں، وغیرہ، تو طلاق کی نیت کے باوجود طلاق نہیں ہوتی۔ اس طرح کے الفاظ کے استعمال کے بعد لوگ پریشان ہوتے ہیں کہ خدانخواستہ طلاق ہوگئی ہے۔''

اگر شوہر طلاق کی نیت سے درج ذیل جملوں میں سے کسی کا استعمال کرے تو طلاق ہوجاتی ہے:

''بساتا نہیں، اپنا بندوبست کرلو، میری بہن کی طرح ہے، آج سے میری بیوی نہیں ہو، تعلق نہیں، میرے اور تمہارے درمیان نکاح نہیں ہے، جاؤ چلی جاؤ، جہنم میں جاؤ، میرا تیرا کوئی رشتہ نہیں، تجھ سے کوئی واسطہ نہیں، وغیرہ۔''

جب کہ بحالتِ غصہ اور طلاق کی گفتگو کے وقت ان الفاظ سے بلا نیت طلاق ہوجاتی ہے:

''اپنا دوسرا انتظام کرلو، میری طرف سے صاف جواب ہے، جس سے چاہو نکاح کرلو، نکاح فسخ کرتا ہوں، میری طرف سے فیصلہ ہے، وغیرہ۔''

اس قسم کے الفاظ میں عموماً شوہر کا بیان یہ ہوتا ہے کہ اس کی نیت طلاق کی نہیں تھی، حالانکہ قرینے کی موجودگی میں طلاق ہوجاتی ہے۔ اس کے علاوہ آزاد، حرام اور چھوڑ دیا وغیرہ کے الفاظ ایسے ہیں جن سے نیت کے بغیر بھی طلاق ہوجاتی ہے۔

ان مثالوں سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ کنائی الفاظ کے احکام مختلف بھی ہیں اور مشکل بھی ہیں۔ دراصل الفاظِ کنایہ سے طلاق کا وقوع شوہر کی نیت پر موقوف ہوتا ہے۔ اگر شوہر کی نیت طلاق کی ہے تو طلاق واقع ہوجاتی ہے، یا اگر کنایہ کا استعمال عرف میں طلاق کے لیے ہوتو بھی طلاق واقع ہے، کیونکہ عرف نیت کے قائم مقام ہوتا ہے، لیکن اگر نیت اور عرف میں سے کچھ نہ ہوتو پھر کنایات کی نوصورتوں میں سے صرف تین میں بغیر نیت کے طلاق واقع ہوتی ہے، وہ تین صورتیں درج ذیل ہیں:

۱:- حالتِ مذاکرہ ہو اور سب وشتم کے الفاظ ہوں۔

۲:- حالتِ مذاکرہ ہو اور جواب کے الفاظ ہوں۔

۳:- حالتِ غضب ہو اور جواب کے الفاظ ہوں۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ تمام ہی کنایات سے نیت کی موجودگی میں طلاق کا ہونا ایک مسلم اصول ہے، اسی طرح عرف ہوتو کنایہ صریح ہے اور صریح میں بھی نیت کی ضرورت نہیں ہوتی ہے، لیکن نیت یا عرف نہ ہوتو پھر شوہر کی نیت کو جانچا جاتا ہے۔

شوہر کی نیت جانچنے کا ذریعہ ''قرینہ'' ہے اور قرینہ بول یا ماحول ہے۔ ''بول'' سے مراد وہ لفظ ہے جو شوہر نے استعمال کیا ہے اور ماحول سے مقصود وہ صورت حال ہے جس میں لفظ استعمال کیا گیا ہے، بالفاظِ دیگر شوہر نے کیا کہا ہے؟ اور کس موقع پر کہا ہے؟ دونوں پہلوؤں کو دیکھنا ضروری ہے۔ فقہاء لکھتے ہیں کہ ماحول تین قسم کا ہوتا ہے:

۱:- حالتِ رضا ۲:- حالتِ غضب ۳:- حالتِ مذاکرہ

بول یعنی الفاظ بھی تین قسم کے ہیں:

۱:- رد کے الفاظ ۲:- سب وشتم کے الفاظ ۳:- جواب کے الفاظ

اس طرح کل نوصورتیں بن جاتی ہیں، جو درج ذیل نقشے میں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں:

نقشہ نمبر:1

	رد کے الفاظ	سب وشتم کے الفاظ	جواب کے الفاظ
حالتِ رضا	1	2	3
	نیت ضروری ہے	نیت ضروری ہے	نیت ضروری ہے
حالتِ غضب	4	5	6
	نیت ضروری ہے	نیت ضروری ہے	نیت ضروری نہیں ہے
حالتِ مذاکرہ	7	8	9
	نیت ضروری ہے	نیت ضروری نہیں ہے	نیت ضروری نہیں ہے

اسی نقشہ کو اس طرح پلٹ دیا جائے کہ الفاظ اور حالات کی جگہیں ایک دوسرے سے بدل دی جائیں تو پھر بھی صورتیں برقرار رہتی ہیں، مثلاً:

نقشہ نمبر:2

	حالتِ رضا	حالتِ غضب	حالتِ مذاکرہ
رد کے الفاظ	1	2	3
	نیت ضروری ہے	نیت ضروری ہے	نیت ضروری ہے
سب وشتم کے الفاظ	4	5	6
	نیت ضروری ہے	نیت ضروری ہے	نیت ضروری نہیں ہے
جواب کے الفاظ	7	8	9
	نیت ضروری ہے	نیت ضروری نہیں ہے	نیت ضروری نہیں ہے

اس تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ:

۱:- حالتِ رضا میں تینوں قسم کے الفاظ میں نیت کی ضرورت ہے اور رد کے الفاظ میں تینوں حالات میں نیت ضروری ہے۔

۲:- حالتِ غضب میں شروع کے دونوں قسم کے الفاظ میں نیت کی ضرورت ہے اور سب وشتم کے الفاظ میں شروع کے دو حالات میں نیت کی ضرورت ہے۔

۳:- حالتِ مذاکرہ میں صرف رد کے الفاظ میں نیت کی ضرورت اور جواب کے الفاظ میں

صرف حالتِ رضا میں نیت کی ضرورت ہے۔

رد کے الفاظ میں ماحول کو اور خوشی کے ماحول میں الفاظ کو دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں ہے، اس طرح ایک سے لے کر پانچ تک یہ کل پانچ صورتیں بن گئیں، جن میں نیت کی ضرورت ہے۔ چھٹی صورت یہ ہے کہ حالتِ مذاکرہ ہو اور رد کے الفاظ ہوں۔

ان چھ صورتوں میں بلا نیت یا عرف طلاق واقع نہیں ہوتی ہے، البتہ شوہر نیت کا انکار کرے تو اس سے حلف لیا جاتا ہے، کیونکہ ہر کنایہ میں طلاق کا احتمال ہوتا ہے۔ باقی تین صورتوں میں بلا نیت بھی طلاق واقع ہوجاتی ہے، جو درج ذیل ہیں:

۱:- سب وشتم کے الفاظ ہوں اور حالتِ مذاکرہ ہو

۲:- جواب کے الفاظ ہوں اور حالتِ مذاکرہ ہو۔

۳:- جواب کے الفاظ ہوں اور حالتِ غضب ہو۔

گویا نو حالتوں میں سے صرف تین صورتیں ایسی ہیں جن میں نیت اور عرف کے بغیر بھی کنایہ سے طلاق ہوجاتی ہے، لہٰذا ہم کنایات کے بارے میں، بلکہ تمام الفاظِ طلاق کے بارے میں ایک اصول کے طور پر کہہ سکتے ہیں کہ کسی لفظ سے طلاق اس وقت ہوتی ہے کہ:

۱:- جب نیت طلاق کی ہو، یا

۲:- کوئی لفظ صریح ہو خواہ رجعی ہو یا بائن، یا

۳:- جب حالتِ مذاکرہ میں سب وشتم یا جواب کے الفاظ ہوں، یا

۴:- حالتِ غضب میں جواب کے الفاظ ہوں۔

کنایہ کے متعلق ایک آخری حل طلب امر یہ رہ جاتا ہے کہ بول اور ماحول سے فقہاء کی منشاء کیا ہے؟ دراصل فقہاء نے ایسے اصول دے دیئے ہیں کہ ان پر پرکھ کر طلاق کے وقوع اور عدمِ وقوع کا فیصلہ کیا جاسکتا ہے، اور وہ اصول دو ہیں:

۱:- ایک یہ کہ لفظ کا معنی طلاق کا ہو۔

۲:- دوسرے یہ کہ وہ طلاق کے لیے استعمال ہوا ہو۔

کبھی لفظ کا معنی اچھا ہوتا ہے، مگر اس کا استعمال مذموم مقصد کے لیے ہوتا ہے اور کبھی اس کے برعکس ہوتا ہے۔ فقہاء چاہتے ہیں کہ طلاق کی گنجائش رکھنے والا لفظ لازماً طلاق کے لیے ہی استعمال ہوا ہو۔

دراصل ''بول'' سے لغت مراد ہے اور ''دلالت حال'' سے استعمال مراد ہے۔ فقہاء کا مقصد یہ ہے کہ صرف لغوی معنی پر مدار نہیں، بلکہ لفظ کے استعمال کو بھی دیکھنا ضروری ہے اور صرف استعمال پر بھی

انحصار درست نہیں، بلکہ لفظ میں بھی طلاق کی صلاحیت ہونا چاہیے۔ اس طرح ان دو اصولوں کے بیان سے فقہاء نے کنایہ کے متعلق ایک میزان اور کسوٹی فراہم کردی ہے، جس پر جانچ کر کسی بھی زبان کے کسی بھی لفظ کو پرکھا جاسکتا ہے۔ اس طرح کے اصول منقح شکل میں سامنے ہوں تو فہم اور ضبط میں سہولت رہتی ہے، جزئیات بھی منتشر نہیں معلوم ہوتیں اور سب سے بڑھ کر متعلقہ باب سے مربوط اور درست واقفیت حاصل ہوجاتی ہے، ورنہ تو جزئیات بکھری اینٹوں کا مجموعہ ہوتی ہیں جو عمارت کہلانے کی مستحق نہیں ہوتیں۔

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جزئیات قدر و قیمت نہیں رکھتیں۔ فقہِ اسلامی اور خصوصاً فقہ حنفی میں جزئیات سے مفر نہیں، کیونکہ انہی کے ذریعے سے کچھ سے بہت کچھ کی جانب اور جزء سے کل کی طرف سفر ہوتا ہے، انہی سے اصول کی صحت معلوم ہوتی ہے، ان ہی کے قدرِ مشترک کا نام کلیات ہے، فقہ کی وسعت بھی ان ہی کے بدولت ہے اور فقہ غیر فقیہ افراد کے ہاتھوں دست و برد سے بھی ان ہی کے ذریعے محفوظ ہے، ان وجوہ سے جزئیات کا بیان ضروری ہے۔

آخر میں ایک اہم قابلِ غور بات یہ ہے کہ طلاق کے جو الفاظ مختصر، سیدھے سادے اور دوٹوک ہوں، اگر شوہر اسی قدر جملوں پر اِکتفا کرے تو مسئلہ کا جواب آسانی سے سمجھ آجاتا ہے، مگر عموماً شوہر کی گفتگو طویل ہوتی ہے، جس میں مقصودی جملے کی تلاش بسا اوقات بھوسے میں سوئی کی تلاش کی مانند ہوتی ہے، پھر اگر مقصودی جملہ ذو معنی ہو تو مشکل دوہری ہوجاتی ہے، کیونکہ کنایہ خود ذو معنی ہوتا ہے اور ذو معنی جملے میں استعمال سے اس کا حل مزید مشکل ہوجاتا ہے، یہ مشکل اس وقت شدید تر ہوجاتی ہے جب شوہر ایک ہی جملے میں ایک سے زائد طلاق کے الفاظ استعمال کرتا ہے، مثلاً: ''طلاق دے کر آزاد کرتا ہوں۔'' یہ دراصل دو جملے ہیں: ''طلاق دیتا ہوں اور آزاد کرتا ہوں۔'' شوہر نے دو جملوں کو لفظ ''اور'' کے ساتھ ملانے کے بجائے جملہ حالیہ معطوفہ استعمال کر کے ملا دیا ہے اور اس کا یہ استعمال فصیح بھی ہے، اس جملے میں بظاہر دو طلاقیں واقع ہونی چاہئیں، مگر حقیقت میں ایک طلاق واقع ہے۔

اسی طرح اگر شوہر کہتا ہے کہ ''جا تجھے طلاق ہے'' تو اس میں ''جا'' کو الگ سے طلاق کا لفظ شمار کرنے کی ضرورت نہیں ہے، یہ ایسا ہی ہے جیسا کہتے ہیں کہ ''چل دور ہو''، ''آیئے تشریف رکھئے''، ''جاؤ جا کر سو رہو۔'' ان مثالوں میں ''چل''، ''آیئے'' اور ''جاؤ'' سے کوئی غرض متعلق نہیں ہے، بلکہ مطلوبہ جملے ''دور ہو''، ''تشریف رکھیے'' وغیرہ ہیں۔

ان مثالوں کے تذکرہ سے مقصد یہ ہے کہ کتاب کے باوجود شخصیات سے استفادہ کی ضرورت باقی رہتی ہے۔